© rasailojaraid.com

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی

دورِ حاضر کا ایک عظیم بُت

مغربی جمہوریت

موجودہ دور میں مغربی جمہوریت کا تصور ذہنوں پر کچھ اس طرح مسلط ہو چکا ہے کہ زندگی کے ہر پہلو میں اس کی تباہ کاریوں کے مشاہدہ کے باوجود اس کے خلاف لب کشائی کی جرأت بہت کم لوگوں کو ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ جو لوگ خاک و خون کی ہولی کھیل کر کوئی انقلاب لانے ہیں، ان کے قائد بھی عوام کو مطمئن کرنے کیلئے سب سے پہلے یہی دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کا مطمح نظر "جمہوریت کی بحالی" ہے۔ عوام کو بھی جب حکومت سے کچھ شکایات پیدا ہوں تو وہ بھی "جمہوریت ہی کی بحالی" کے نام پر مظاہرے کرتے اور تحریکیں چلاتے ہیں۔ گویا جمہوریت اور اس کی بحالی ایک ایسا تصور ہے جس پر حاکم اور رعایا، موافق اور مخالف سبھی ایک جیسا ایمان رکھتے ہیں۔ آج ہم اسی جمہوریت کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

جمہوریت کو سیاست و ریاست کے میدان میں انسانی غور و فکر کی معراج سمجھا جاتا ہے اور چند جزوی ترامیم کے ساتھ دنیا کے بیشتر ممالک میں اور اسی طرح پاکستان میں بھی یہی جمہوری نظام رائج ہے۔ بحث و تمحیص سے پیشتر ضروری ہے کہ اس کے مبادیات پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

مغربی جمہوریت کی تعریف اور مختصر تعارف:

جمہوریت کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں۔ جن میں سے ابراہیم لنکن، ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے سولہویں صدر، کی تعریف زیادہ جامع قرار دی گئی ہے۔ اور وہ یوں ہے:

"GOVERNMENT OF THE PEOPLE, BY THE PEOPLE, FOR THE PEOPLE."

یعنی "عوام پر، عوام کی حکومت، عوام کی مرضی سے"

گویا عوام کو یہ ذہن نشین کرایا جاتا ہے کہ یہ حکومت ان کی اپنی ہی ہے اور ان پر کسی دوسری حاکمیت کا دباؤ نہیں ہے۔ اور اس کا طریق کار یہ ہے کہ عوام میں سے ہر بالغ مرد اور عورت اپنا نمائندہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

منتخب کرنے کا حق رکھتا ہے تاکہ یہ منتخب نمائندے ان پر حکومت کریں اور ان کیلئے قانون بنائیں۔

جمہوریت کی دو قسمیں بتائی جاتی ہیں :

۱۔ بلاواسطہ جمہوریت ۔ جس میں تمام شہری بلاواسطہ حکومت کے انتظام میں حصہ لے سکیں ۔ یہ قدیم یونان اور روما کی شہری ریاستوں میں پائی جاتی تھی ۔ ایسا نظام چونکہ صرف ایک چھوٹی سی ریاست میں ہی قائم ہو سکتا ہے ۔ لہٰذا آج کے دور میں یہ ناقابلِ عمل ہے ۔ سوائے سوئٹزرلینڈ کے چند علاقوں اور امریکہ کی بعض میونسپلٹیوں کے اور کسی جگہ نہیں پائی جاتی ۔

۲۔ بالواسطہ جمہوریت ۔ اس میں عوام ایک معینہ عرصہ کیلئے اپنے نمائندے منتخب کرکے مجلسِ قانون ساز کی تشکیل کرتے ہیں جو ملک کے لئے قانون بناتی ہے ۔ جمہوریت کی یہی قسم آجکل رائج ہے۔

جمہوری حکومتوں میں اگر عاملہ اور مجلسِ قانون آپس میں متحد ہوں اور مشترکہ طور پر ایک ہی جماعت کی زیرِ نگرانی کام کرتے ہوں تو اسے وزارتی یا پارلیمانی طرزِ حکومت کہتے ہیں ۔ اس میں صدر کی حیثیت محض ایک آئینی سربراہ کی ہوتی ہے، تمام اختیارات وزیرِ اعظم کو ہوتے ہیں ۔ اور اگر عاملہ اور مقننہ علیحدہ اور آزاد ہوں تو ایسی طرزِ حکومت کو صدارتی کہا جاتا ہے ۔ اس صورت میں وزیرِ اعظم اور صدر کے اختیارات تقریباً برابر ہوتے ہیں ۔ صدر اپنی کابینہ میں حزبِ اختلاف کا نمائندہ بھی لے سکتا ہے جبکہ پارلیمانی نظام میں یہ صورت نہیں ہوتی ۔

پاکستان کے موجودہ دستور، جو اپریل ۱۹۷۳ء میں منظور ہوا اور ۱۴ اگست ۱۹۷۳ء کو ملک بھر میں نافذ ہوا، کے مطابق ملک میں پارلیمانی نظام رائج ہے ۔ پارلیمنٹ ملک کا اعلیٰ ترین قانون ساز ادارہ ہے جو دو ایوانوں پر مشتمل ہے ۔ ایوانِ بالا کا نام سینٹ اور ایوانِ زیریں کا نام قومی اسمبلی ہے۔ قومی اسمبلی میں نشستوں کی کل تعداد ۲۰۰ ہے ۔ یہ نشستیں صوبوں کی آبادی کے تناسب کے مطابق طے کی جاتی ہیں ۔ قومی اسمبلی کے انتخاب ہر پانچ سال بعد ہوتے ہیں ۔ سینٹ کی کل نشستیں ۶۳ ہیں ۔ ایوانِ بالا میں تمام صوبوں کو یکساں نمائندگی دی گئی ہے ۔ ہر صوبہ کیلئے ۱۴ نشستیں مخصوص ہیں۔ علاوہ ازیں ۲ وفاقی حکومت کیلئے اور ۵ وفاقی حکومت کے زیرِ انتظام قبائلی علاقوں کیلئے مخصوص ہیں ۔ سینٹ کے ممبران کا انتخاب ۴ سال بعد ہوتا ہے لیکن اس کی صورت یہ ہے کہ نصف ممبران کا انتخاب ہر دو سال بعد ہوتا رہتا ہے ۔

اس نظامِ حکومت میں صدر یا سربراہِ مملکت کا انتخاب قومی اسمبلی اور سینٹ دونوں کے مشترکہ اجلاس میں ۵ سال کیلئے کیا جاتا ہے لیکن اس کی حیثیت محض آئینی سربراہ کی ہے، تمام انتظامی اور حکومتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اختیارات کا مالک وزیرِ اعظم ہے کیونکہ صدر کا کوئی حکم اس وقت تک نافذ العمل نہیں ہوسکتا جب تک وزیرِ اعظم اس پر دستخط ثبت نہ کر دے۔

علاوہ ازیں پاکستان کے چاروں صوبوں میں ایک ایوانی مقننہ قائم کی گئی ہے جسے صوبائی اسمبلی کہا جاتا ہے۔ صوبوں کی آبادی کے تناسب کا لحاظ رکھتے ہوئے ان اسمبلیوں میں نشستوں کی تعداد یہ ہے:

پنجاب: ۲۴۰، سندھ: ۱۰۰، سرحد: ۸۰، بلوچستان: ۴۰، کل: ۴۶۰

نشستیں ہیں۔ جن کا انتخاب دستور کے مطابق ہر ۵ سال بعد ہونا چاہیے۔

سینٹ، قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کے بعد ملک بھر میں بلدیاتی اداروں (میونسپل کمیٹیاں وغیرہ) کے بھی انتخابات ہوتے رہتے ہیں۔ یہ سب کچھ سرکاری اور نیم سرکاری سطح پر ہوتا ہے۔ نجی سطح پر سیاسی پارٹیوں کے داخلی انتخابات، مختلف جماعتوں اور تنظیموں کے انتخابات، ٹریڈ یونینوں، سکولوں اور کالجوں کے انتخابات، غرض انتخابات کا ایک ایسا لامتناہی سلسلہ چل نکلتا ہے کہ کوئی وقت ایسا نہیں گزرتا جب کہیں نہ کہیں انتخابات نہ ہو رہے ہوں۔

اس جمہوری نظام کے فوائد درج ذیل بیان کئے جاتے ہیں:

۱۔ چونکہ عوام اپنے نمائندے خود منتخب کرتے ہیں لہٰذا یہ عوامی مسائل کے حل کا مؤثر ترین ذریعہ ہے۔

۲۔ جمہوریت، آزادی اور مساوات کے مشترکہ اصولوں پر قائم ہے۔ ہر شخص یکساں طور پر سیاسی حقوق کا مالک اور نظامِ حکومت میں حصہ لے سکتا ہے۔ بشرطیکہ اسے عوام کی تائید حاصل ہو اور حکومت پر کسی خاص طبقہ کی اجارہ داری نہیں ہوتی۔

۳۔ اس نظام میں چونکہ حزبِ اختلاف کا وجود ضروری ہے اور عاملہ پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہوتی ہے لہٰذا حزبِ اختلاف حکمران پارٹی کی غلط روی یا غلط پالیسیوں پر تنقید کرتی اور اسے راہِ راست پر لانے کا سبب بنتی ہے۔

۴۔ اس نظام میں عوام کو اظہارِ خیال یعنی تقریر و تحریر کی آزادی کا حق حاصل ہوتا ہے، لہٰذا وہ بھی حکومت کی غلط روی پر نکتہ چینی کرکے اسے راہِ راست پر رکھنے کا موجب بنتے ہیں۔

۵۔ اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ طرزِ حکومت انتقالِ اقتدار کا پُر امن ذریعہ ہے۔ اگر حکمران پارٹی اپنے اقتدار کے دوران ملک و قوم کی صحیح خدمت نہیں کرسکی تو اسے آئندہ انتخاب میں بآسانی اقتدار سے علیحدہ کیا جاسکتا ہے۔

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ آیا عملاً بھی یہ فوائد حاصل ہو رہے ہیں؟ پاکستان چونکہ محض ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جمہوری ریاست نہیں بلکہ نظریاتی ریاست بھی ہے جو اسلامی نظام کے قیام کیلئے وجود میں آئی تھی۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اسلامی نقطۂ نگاہ سے اس طرزِ حکومت اور طریق کا جائزہ لیا جائے۔ بعد ازاں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اس جمہوریت کے اثرات کا جائزہ لیا جائیگا۔

مغربی جمہوریت اور اسلامی نظریات

پاکستان کا وجود دو قومی نظریہ کا مرہونِ منت ہے جو محض اس لئے قائم کیا گیا تھا کہ یہاں اسلامی نظام رائج کیا جائے اور اسے ایک فلاحی مملکت بنایا جائے۔ جیسا کہ بانیٔ پاکستان کی کئی تحریروں اور تقریروں سے ثابت ہوتا ہے۔ اسی بات کے نتیجہ میں مارچ ۱۹۴۹ء میں قراردادِ مقاصد منظور ہوئی تھی۔

۱۔ حاکمیت کا تصور:

قراردادِ مقاصد کی رو سے یہ طے پایا کہ اقتدارِ اعلیٰ کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ اور پاکستان کے شہری اسے کتاب وسنت کی مقررہ حدود کے اندر رہ کر استعمال کریں گے۔ بعد میں بنائے جانے والے تمام دساتیر حتیٰ کہ آخری دستور اپریل ۱۹۷۳ء میں بھی قراردادِ مقاصد کا مکمل متن بطور دیباچہ شامل ہے۔ مگر یہ ایک بڑا المیہ ہے کہ یہ قرارداد محض زیبِ داستاں ہی بنی رہی جس کا عملی نفاذ آج تک نہیں ہوسکا اور آج بھی مغربی جمہوریت کے برگ وبار ہی پھل پھول رہے ہیں۔

آئین کو قرآن وحدیث کے مطابق ڈھالنے کے لئے مختلف ادوار میں کئی اسلامی نظریاتی اور مشاورتی کونسلیں تشکیل دی جاتی رہیں جن کی کوئی نمایاں کارکردگی آج تک سامنے نہیں آسکی۔ ایک تو ان کونسلوں کی کام کی رفتار بہت سست تھی، دوسرے اگر کبھی وہ اپنی سفارشات حکومت کو بھیجتی بھی تھیں تو انہیں کبھی شرفِ پذیرائی نہ بخشا گیا۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ پہلے قوانین، جو کتاب وسنت کے خلاف تھے، بدستور موجود رہے بلکہ آئندہ ایسے نئے قوانین بھی بنتے رہے جو قرآن وحدیث سے ٹکراتے تھے۔ اس سلسلہ میں ایوبی دور کے عائلی قوانین کو بطورِ مثال پیش کیا جاسکتا ہے جن پر احتجاج کے لئے علماء نے تحریک بھی چلائی تھی۔ لیکن ان کا یہ احتجاج صدا بصحرا ثابت ہوا۔ آج بھی صرف مجوزہ فارم نکاح نامہ کی دفعات دیکھنے سے ہی معلوم ہوسکتا ہے کہ اس میں کتاب وسنت کے احکام کو کیونکر مسخ کیا گیا ہے! —— دور کیوں جائیے، سابقہ نمائندہ جمہوری حکومت، جس نے ۱۹۷۳ء میں پاکستان کو منتخب نمائندوں کا پاس کردہ دستوری آئین دیا اور جس کے ابتدائیہ میں قراردادِ مقاصد کا مکمل متن موجود ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے تصور کے علی الرغم نعرہ ہی یہ تھا کہ "طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں"؟ ظاہر ہے کہ یہ نعرہ مغربی جمہوریت کے علمبرداروں کا تو ہوسکتا ہے، قراردادِ مقاصد تسلیم کرنے والوں کا نہیں ہوسکتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت ،، اور ،، طاقت کا سرچشمہ عوام ،، میں لفظی موشگافیاں پیدا کی جائیں۔ لہٰذا ہم وضاحت کیلئے سابقہ حکمران پارٹی کے ترجمان اخبار ،، مساوات ،، مؤرخہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۸ء سے اقتباس پیش کرتے ہیں:

،، پاکستان کی صرف ترقی پسند قوتوں اور جماعتوں (یعنی پیپلز پارٹی، بائیں بازو اور اسلام دشمن جماعتوں) کو ہی نہیں بلکہ ان تمام اعتدال پسند اور جمہوریت پرست عناصر کو متحد ہو کر ایک ایسا مشترکہ لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیئے جو جمہوریت اور عوام کی حاکمیت پر یقین پر مبنی ہو اور آئین اور عوام کی بالادستی کو آگے بڑھائے۔،،

غور فرمائیے، اس پارٹی کو ایک طرف تو ۱۹۷۳ء کے آئین کی تباہی کی فکر لاحق ہے جس کی بنیاد قرار دادِ مقاصد پر ہے اور جس میں اللہ تعالیٰ کو حاکمِ اعلیٰ تسلیم کیا گیا ہے لیکن دوسری طرف جمہوریت اور عوام کی حاکمیت پر یقین کا پرچار کر کے اس آئین کی عملی طور پر تردید کی جا رہی ہے۔

سوچنے کی بات ہے کہ اگر انہیں عوام کی حاکمیت پر اتنا ہی یقین ہے تو جس وقت حکومت ان کے پاس تھی اور بزعمِ خویش عوامی طاقت بھی ان کے ساتھ تھی۔ تو آخر وہ دوسری کون سی طاقت تھی جس نے چشم زدن میں انقلاب برپا کر دیا اور انہیں یہ برے دن دیکھنے نصیب ہوئے۔

یہ تو ان لوگوں کا حال ہے جو ذہنی طور پر آج تک خدا کی حاکمیت کے قائل نہیں ہوئے۔ لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ جو جماعتیں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا نعرہ لگاتی اور فی الواقع ملک میں اسلامی نظام رائج کرنے کی خواہاں ہیں، وہ بھی غیر شعوری طور پر اللہ کی حاکمیت کے بجائے عوام کی حاکمیت پر ہی ایمان رکھتی ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ تین ماہ پیشتر اگست ۷۸ء میں جب صدرِ مملکت نے قومی اتحاد کو حکومت میں شامل کرنے کی تجویز پیش کی اور بعض اسلام پسند جماعتوں نے اس دعوت کو قبول کر لیا تو قومی اتحاد کے ایک بڑے لیڈر اور مذہبی رہنما نے یہ بیان دیا تھا کہ ،، حکومت میں شمولیت پر عوام ہمیں گالیاں دیتے ہیں اور ہم نے اپنے سیاسی کردار کو داؤ پر لگا کر ملک و قوم کے وسیع تر مفاد اور نظامِ اسلام کی ترویج کے لئے حکومت میں شمولیت گوارا کی ہے ،،

اس بیان سے واضح ہے کہ ذہنوں پر عوامی حاکمیت کی چھاپ کتنی مضبوط ہے۔ ایک مردِ مومن شرعی احکام کی تعمیل میں ،، لومۃ لائم ،، کی پرواہ نہیں کیا کرتا اور اس کا سیاسی کردار بھی ہوتا ہے کہ حتی المقدور اسلامی نظام کی ترویج کے لئے اپنی تمام تر قوتیں صرف کر دے۔ اور جب یہ موقع میسر آتا ہے تو پھر اور کون سے سیاسی کردار کو داؤ پر لگانے کی بات کی جاتی ہے۔ کہیں یہی خدشہ تو دامن گیر نہیں کہ اگر خدانخواستہ یہ حکومت اسلامی نظام کی ترویج میں ناکام ہو گئی تو آئندہ انتخابات میں ہمارا کیا بنے گا؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور جو سیاسی جماعتیں اپنے مفادات کی خاطر قومی حکومت میں شامل نہیں ہوتیں، وہ لگاتار یہ طعنہ دے رہی ہیں کہ یہ لوگ چور دروازے سے حکومت میں شامل ہوئے ہیں۔ اور ان طعنہ دینے والوں میں صرف لادینی تصور کی حامل جماعتیں ہی نہیں، اسلام پسند جماعتیں بھی شامل ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ باقاعدہ اور مروجہ قسم کے انتخابات کے ذریعہ منتخب ہو کر حکومت میں شامل نہیں ہوئے۔ ہمیں لادینی جماعتوں سے سروکار نہیں البتہ اسلام پسند جماعتوں سے یہ پوچھنے کا حق ضرور رکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے محض چند بڑے بڑے صحابہؓ سے مشورہ کے بعد حضرت عمرؓ کو خلیفہ نامزد کر دیا تھا تو اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ اور اگر آج صدرِ مملکت (جنرل ضیاء) کچھ اہلِ بصیرت سے مشورہ کرنے کے بعد کچھ لوگوں کو حکومت میں شامل کر لیں تو ان لوگوں پر چور دروازہ سے داخل ہونے کی پھبتی کسنے کیلئے اسلامی نقطۂ نظر سے کیا جواز ہے جبکہ اسلامی طرزِ جمہوریت کے تقاضے پورے ہو چکے؟ اس کے دو ہی جواب ہو سکتے ہیں۔ یا تو مغربی طرزِ جمہوریت پر ان کا ایمان آنا پختہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں اسلامی شورائی نظام اور جمہوریت کو ہیچ سمجھتے ہیں یا پھر ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ انہیں جاہ طلبی کی ہوس ایسا واویلا کرنے پر مجبور کر رہی ہے!

۲۔ کرسی کی ہوس:

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ جہاں مغربی جمہوریت کا نظام رائج ہو وہاں تقریباً ہر وقت ہی انتخاب کا دھندا چلتا رہتا ہے۔ اور پاکستان کا ہر وہ بالغ شہری کرسی کا امیدوار بن سکتا ہے جس کا نام فہرست میں درج ہو۔ اس صورتِ حال کی بنا پر ہر ایسے شخص کے دل میں کرسی کی ہوس انگڑائیاں لینے لگتی ہے جس کے پاس چار پیسے ہوں —— جاہ طلبی کا مرض وبا کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ خود غرضی کی طرح جاہ طلبی بھی ایسا مہلک مرض ہے جو ایک فلاحی اور نظریاتی مملکت کی بیخ و بن کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

"عَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ عَنْ أَبِيهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَا ذِئْبَانِ جَائِعَانِ أُرْسِلَا فِي غَنَمٍ بِأَفْسَدَ لَهَا مِنْ حِرْصِ الْمَرْءِ عَلَى الْمَالِ وَالشَّرَفِ لِدِينِهِ" (ترمذی)

"حضرت کعب بن مالکؓ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: بکریوں کے ریوڑ میں دو بھوکے بھیڑیئے اتنی تباہی نہیں مچا سکتے جتنی انسان کی حبِ جاہ و مال اس کے دین کیلئے تباہ ہو سکتی ہے۔"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وجہ یہ ہے کہ اقتدار کا خبط، خواہ وہ اقتدار کسی درجے کا ہو، جب عقل و ذہن پر سوار ہو جاتا ہے تو روحانی اقدار اور مکارم اخلاق کا مسئلہ اس کے سامنے کوئی مسئلہ نہیں رہتا اور وہ اس کے حصول کیلئے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کرنے میں جھجک محسوس نہیں کرتا۔ لہٰذا مغربی جمہوریت کا پہلا قدم ہی قرآن و سنت کے خلاف اٹھتا ہے۔

۳۔ درخواست امیدواری:

کرسی کیلئے خود کو پیش کرنا یا اس کے لئے درخواست دینا بھی اسلامی نقطۂ نظر سے غلط اور قرآن و حدیث کے منافی ہے:

"عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ دَخَلْتُ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَا وَرَجُلَانِ مِنْ بَنِیْ عَمِّیْ فَقَالَ اَحَدُھُمَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَمِّرْنَا عَلٰی بَعْضِ مَا وَلَّاکَ اللّٰہُ وَقَالَ الْآخَرُ مِثْلَ ذٰلِکَ فَقَالَ: اِنَّا وَاللّٰہِ مَا نُوَلِّیْ عَلٰی ھٰذَا الْعَمَلِ اَحَدًا سَاَلَہٗ وَلَا اَحَدًا حَرَصَ عَلَیْہِ" وفی روایۃ قال: لَا نَسْتَعْمِلُ عَلٰی عَمَلِنَا مَنْ اَرَادَہٗ" (متفق علیہ)

حضرت ابوموسیٰ رضؓ کہتے ہیں کہ میں اپنے دو چچیرے بھائیوں کے ساتھ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ ان میں سے ایک نے عرض کی، "اے اللہ کے رسول، اللہ نے آپ کو جو حکومت بخشی ہے، اس کے کچھ حصہ پر ہمیں حاکم بنا دیجئے۔" پھر دوسرے نے بھی ایسی ہی بات کہی۔ آپؐ نے فرمایا۔ "خدا کی قسم ہم کسی ایسے شخص کو حاکم نہیں بنایا کرتے جو اس کے لئے درخواست کرے اور نہ ہی کسی ایسے شخص کو حاکم بناتے ہیں جو اس کی حرص رکھتا ہو" —— ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا۔ "ہم اپنے انتظامی امور میں کسی ایسے شخص کو شامل نہیں کرتے جو اس کا ارادہ رکھتا ہو۔" (بخاری، مسلم)

ایک دوسری روایت میں مسلمانوں کو ایسی درخواست کرنے سے منع فرمایا گیا ہے:

"وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ سَمُرَۃَ قَالَ: قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: لَا تَسْئَلِ الْاِمَارَۃَ فَاِنَّکَ اِنْ اُعْطِیْتَھَا عَنْ مَسْئَلَۃٍ وُکِلْتَ اِلَیْھَا وَاِنْ اُعْطِیْتَھَا عَنْ غَیْرِ مَسْئَلَۃٍ اُعِنْتَ عَلَیْھَا" (متفق علیہ)

"حضرت عبد الرحمٰن بن سمرۃؓ فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:
"امارت (کرسی) کیلئے مت درخواست کر کیونکہ اگر تجھے بذریعہ درخواست کرسی ملے گی تو تمام تر ذمہ داری تمہی پر ہوگی اور اگر تمہیں کرسی بغیر درخواست (اور آرزو) کے مل جائے تو تمہارا ساتھ تعاون کیا جائیگا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۴ - حق رائے دہندگی :

مروجہ جمہوری نظام میں ہر کس و ناکس کو، بشرطِ بلوغت، ووٹ دینے کا حق دیا گیا ہے اور اسے سیاسی مساوات کے خوبصورت الفاظ سے مزین کیا جاتا ہے لیکن اگر عقلی طور پر اس کا تجزیہ کیا جائے تو نظامِ سیاست و ریاست کیلئے اس کے نتائج خوشگوار ہونے کی بجائے تباہ کن ثابت ہوتے ہیں۔

یہ تو ایک مسلمہ اصول ہے کہ کسی بھی معاشرہ میں ذی شعور و دانشمند طبقہ کی تعداد قلیل ہوتی ہے اور اکثریت عوام کالانعام کے زمرہ میں شامل ہوتی ہے۔ بالفاظِ دیگر اسے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ حق کا ساتھ دینے والوں کی تعداد ہمیشہ قلیل ہوا کرتی ہے۔ جبکہ اکثریت اپنی حیوانی اور شہوانی خواہشات کی تکمیل کے درپے ہوا کرتی ہے۔ اگر ہم ایک عام آدمی اور صاحبِ فہم آدمی کی رائے کی قیمت یکساں قرار دے دیں اور محض ووٹوں کی کثرت کی بنیاد پر نمائندوں کا انتخاب عمل میں لایا جائے جیسا کہ مغربی جمہوریت کا بنیادی اصول ہے، تو بہیمیت اور شہوانیت ہی برسرِ اقتدار آئیگی۔ اندریں صورت حق کا غالب آنا ناممکنات سے ہے۔ اس حقیقت کو قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے :

"وَإِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ"

کہ (اے نبیؐ) اگر آپ لوگوں کی اکثریت کے پیچھے لگیں گے تو یہ تو آپکو اللہ کی راہ سے بہکا دیں گے !

ایک دوسرے مقام پر یہی حقیقت ان الفاظ میں بیان فرمائی گئی ہے :

"قُلْ لَا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ"

(اے پیغمبرؐ، ان لوگوں سے) کہہ دیجئے کیا خبیث اور طیب ایک جیسے ہو سکتے ہیں؟ اگرچہ خبیث کی کثرت آپکو بھلی ہی کیوں نہ لگے !

اس طریقِ انتخاب سے منتخب ارکان کی اکثریت ایسے مُترفین (مرفہ الحالی) پر مشتمل ہوتی ہے جو اخلاق سے عاری اور فہم و بصیرت سے یکسر محروم ہوتے ہیں۔ یہ لوگ قومی و ملکی مسائل پر بحث کے دوران رائے شماری کے لئے ہاتھ کھڑا کرنے کے سوا کچھ نہیں جانتے۔ اسلام کے شورائی نظام میں نہ تو ایسے کھمبوں کی گنجائش ہے اور نہ ہی اسلام ایسے نظام کی حمایت کر سکتا ہے جو عوام کے اسفل السافلین طبقہ کو اقتدار کے بلند مقام پر فائز کر دیتا ہے۔ یہ ایک بڑا المیہ ہے کہ پاکستان کی قومی اسمبلی میں ارکان کی ایک بھاری اکثریت ڈاکوؤں اور رسہ گیروں پر مشتمل رہی ہے۔

آج کے دور میں بعض اسلامی ذہن رکھنے والے اور اسلامی انقلاب کے داعی لیڈر جب دیکھتے

© rasailojaraid:com

© rasailojaraid.com

ہیں کہ اقتدار پر قبضہ کئے بغیر اسلامی نظام رائج نہیں کیا جاسکتا تو اس کا حل انہوں نے یہ تلاش کیا ہے کہ نیک شہرت رکھنے والے امیدوار کا انتخاب کیا جائے اور عوام میں اسلامی تعلیم کا پرچار کر کے ایسے اشخاص کی مدد کی جائے تا آنکہ اسمبلی میں ایسے نیک لوگوں کی کثرت ہو جائے، موجودہ صورتِ حال میں معاشرہ کی اصلاح اور اسلامی نظام کی ترویج کی یہی واحد صورت ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس سلسلہ میں ان کی تائید نہیں کر سکتے۔ تاریخ شاہد ہے کہ آج تک ووٹوں کے ذریعہ نہ اسلام آیا ہے اور نہ آسکتا ہے۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو انبیاء ضرور اس پرامن ذریعہ انتقال اقتدار کو استعمال کرتے بنی نوع انسان کیلئے کتاب و سنت سے بہتر دستور نا ممکن ہے۔ اور اصلاحِ معاشرہ کیلئے قرآنِ مجید کی تبلیغ و اشاعت بھی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا۔ لیکن گیارہ سال کی انتھک جدّو جہد کے بعد بھی یہ تو نہ ہو سکا کہ مسلمان مکہ میں اسلامی ریاست قائم کر لیتے۔ جب بہترین دستور اور اس کو عملاً نافذ کرنے والے دنیا بھر سے بہترین کارکن اسے کثرتِ آراء کی بنا پر نافذ نہیں کر سکے تو آج کے دور میں یہ کیونکر ممکن ہے؟

اسلامی نظام کی ترویج کے لئے اقتدار کی ضرورت سے انکار نہیں، لیکن رائے عامہ کو صرف تبلیغ کے ذریعے ہموار کرنا اور اس طرح اسلامی انقلاب برپا کرنا خیالِ خام ہے۔ اس کے لئے ہجرت، جہاد اور دوسرے ذرائع ہی اختیار کرنا پڑیں گے جیسا کہ انبیاء اور مجاہدینِ اسلام کا دستور رہا ہے۔

۵- حق رائے دہندگی اور مساواتِ مرد و زن:

تہذیبِ حاضر، مساواتِ مرد و زن کا پُرفریب نعرہ لگا کر عورت کو میدانِ سیاست میں گھسیٹ لائی ہے۔ اور یہ کوئی نئی بات بھی نہیں، قدیم تہذیبوں کا مطالعہ کرنے سے یہ بات بخوبی روشن ہے کہ معاشرہ میں عورت کا مقام متعین کرنے میں ان تہذیبوں نے ہمیشہ افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔ جب بھی کوئی تہذیب اپنے جوبن پر پہنچتی ہے تو وہ حیوانی اور شہوانی خواہشات کی پرستار بن جاتی ہے۔ یہی وہ دور ہوتا ہے جب عورت اور مرد کے ہمہ وقتی اختلاط کے مواقع فراہم کرنے کیلئے نت نئے بہانے سوچے جاتے اور عقلی دلائل پیش کئے جاتے ہیں اور عورت کو بازاری جنس بنا کر قومی اخلاق تباہ کیا جاتا ہے ــــ ہم سرِدست اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتے کہ تہذیبِ مغرب نے کون سے پہلوؤں میں عورت کو مساوات بخشی اور آج مغرب کی عورت کن مسائل سے دوچار ہے۔ اور اسلام کن پہلوؤں میں عورت کو صرف مساوات ہی نہیں بلکہ بلند مقام بھی عطا کرتا ہے! سرِدست یہ کہنا مطلوب ہے کہ سیاست و ریاست کے نظام میں عورت کی شمولیت کو اسلام نے ناپسند فرمایا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَعَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَ قَالَ لَمَّا بَلَغَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّ اَھْلَ فَارِسَ قَدْ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مَلَّكُوا عَلَيْهِمْ بِنْتَ كِسْرىٰ قَالَ : كَيْفَ يُفْلِحُ قَوْمٌ وَلَّوْا اَمْرَهُمْ اِمْرَأَةً ۔ (بخاری)

۔ حضرت ابوبکرہؓ فرماتے ہیں، جب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچی کہ اہلِ فارس نے کسریٰ کی بیٹی پوران، (نوشیرواں کی پوتی، شیرویہ کی بہن) کو اپنا بادشاہ بنالیا ہے، تو فرمایا۔ وہ قوم کیسے فلاح پاسکتی ہے جس نے اپنا سربراہ ایک عورت کو بنالیا ہے!

اسلام نے عورت کو سیاست و ریاست سے درج ذیل وجوہ کی بنا پر الگ رکھا ہے :

۱۔ عورت کا اہم ترین اور فطری فریضہ قوم کے نونہالوں کی صحیح تربیت ہے اور اسی بات پر کسی قوم و ملک کے مستقبل کا انحصار ہوتا ہے۔ اگر عورت اس فریضہ کے بجائے دوسرے کاموں میں الجھ جائے تو جہاں عائلی نظام درہم برہم ہوتا ہے وہاں ملک و قوم کا مستقبل بھی انحطاط پذیر ہوجاتا ہے۔

۲۔ اسلام امیر کیلئے جن شرائط کی پابندی لگاتا ہے، فطری اعتبار سے عورت کا ان پر پورا اترنا مشکل ہے۔

۳۔ اسلام عورت اور مرد کے آزادانہ اختلاط کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کرتا۔ اس سے معاشرہ فحاشی اور اخلاقی انحطاط میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

ان وجوہات کی بنا پر مغربی جمہوریت کی طرز پر عورت کا حق رائے دہندگی، اسلامی تعلیمات کے سراسر منافی ہے البتہ اسلام کے شورائی نظام میں صرف بوقتِ ضرورت عورت کی صلاحیتوں سے استفادہ کیا جاسکتا ہے حضرت عمرؓ نے اپنی وفات سے قبل چھ معزز صحابہ کی ایک سب کمیٹی تشکیل دی تاکہ نئے خلیفہ کا انتخاب عمل میں لایا جاتے۔ اس کمیٹی نے بالاتفاق یہ ذمہ داری حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے سر ڈال دی تو آپ نے اس سلسلہ میں جہاں دوسرے معزز صحابہ کرامؓ سے مشورہ لیا، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی مشورہ لیا تھا۔

اسی طرح عورت ضرورت اور مجبوری کے تحت زندگی کے دوسرے میدانوں میں بھی حصہ لے سکتی ہے۔ مگر ان صورتوں میں احکام (حدود، حجاب وغیرہ) کا پورا پورا لحاظ رکھا جائیگا اور آزادانہ اختلاط کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کیا جائیگا۔

۶۔ قانون سازی :

اسلام میں ایسی قانون سازی کی قطعاً گنجائش نہیں جس کے ذریعہ اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال اور حلال کو حرام بنایا جاتا ہے۔ جیسا کہ آجکل کی اسمبلیاں کررہی ہیں۔ جہاں کبھی شراب کو حلال کرلیا جاتا ہے اور کبھی اس کی حرمت کا قانون پاس ہوجاتا ہے ــــ جہاں سود صرف حلال و طیب ہی نہیں بلکہ اسے حکومت کی سرپرستی حاصل ہوتی ہے ــ جہاں زنا بہ رضا کوئی جرم نہیں ہے۔ حد یہ ہے کہ چند سال پیشتر برطانوی پارلیمنٹ نے ہم جنسی کے نکاح کو قانونی جواز کی سند عطا کی تھی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ کوئی وزیر صاحب لواطت

© rasailojaraid:com

© rasailojaraid.com

کے مرتکب ہوتے۔ یہ مسئلہ پارلیمنٹ میں اٹھایا گیا تو نہ صرف انہیں قانونی تحفظ ملا بلکہ تمام رعایا کو اس فعلِ مردود کی کھلی چھٹی مل گئی۔ وقس علیٰ ہٰذا!

مسلمانوں کا بنیادی آئین و دستور قانون و سنت ہے اور یہ غیر متبدّل (RIGID) ہے۔ کسی مقننہ کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ کوئی ایسا قانون، خواہ عدالتی ہو یا انتظامی، منظور کرے جو قرآن و حدیث سے ٹکراتا ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک ھم الکافرون ... ھم الظالمون ... ھم الفاسقون؟"

کہ "جو کوئی اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ (کتاب و سنت) کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو ایسے لوگ کافر ہیں، ... ظالم ہیں ... فاسق ہیں!" (المائدۃ: ۴۴، ۴۵، ۴۷)

ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے کافر، ظالم اور فاسق ہونے کی بنیادی وجہ جمہوریت کی راہ سے آئے ہوئے نمائندوں اور اسمبلیوں کا وجود ہے۔ اس جمہوری طرزِ انتخاب سے "مترفین" کا ایک ایسا طبقہ برسرِ اقتدار آجاتا ہے جسے اپنی حیوانی اور شہوانی خواہشات کی تکمیل کے علاوہ دوسری باتوں سے کم ہی سروکار ہوتا ہے۔ انہی "مترفین" کو قرآنِ مجید نے "مَلَأ" کے لفظ سے پکارا ہے۔ یعنی یہی سرکاری درباری اور چوہدری حضرات پیغمبروں کی تعلیمات سے انحراف کرتے اور ان سے برسرِ پیکار رہتے آئے ہیں۔ تو آج بھلا یہ طبقہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو کیونکر شرفِ پذیرائی بخش سکتا ہے! یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۹ء کی قراردادِ مقاصد سے لے کر آج تک اس طرف کچھ بھی پیش رفت نہ ہو سکی۔ ایک ایسی اسمبلی جو سر سے پاؤں تک غیر اسلامی بنیادوں پر وجود میں آئی ہو، اس سے یہ توقع رکھنا کہ آئین کو شریعت کے مطابق بنا دیں گے اور آئندہ صرف ذیلی قوانین سازی پر اکتفا کریں گے، اور ان قوانین کی حدود و قیود کی پابندی برداشت کرلیں گے، ہمارے خیال میں ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

اسلام میں اسمبلیوں کے بجائے مجلسِ شوریٰ کا انتخاب عمل میں لایا جاتا ہے اور یہ انتخاب اسلامی جمہوری طریقہ سے کیا جاتا ہے۔ اس مجلس کا کام یہ ہوتا ہے کہ کتاب و سنت کے اصولوں کے تحت موجودہ مسائل سے متعلق ذیلی قوانین بنائے اور دیکھے کہ فلاں مخصوص مسئلہ اس خاص صورتِ حال میں کتاب و سنت کے حکم سے کس طرح زیادہ سے زیادہ مناسبت اور مطابقت رکھتا ہے۔ یہی تفقہ فی الدین یا فقہ ہے اور اسی ذہنی کاوش کا نام اجتہاد ہے۔ چونکہ مسائل اور حالات دونوں چیزیں ہر آن بدلتی رہتی ہیں لہٰذا ہر دور میں اجتہاد اور فقہ کی نئی تدوین کی ضرورت رہتی ہے اور یہی مجلسِ شوریٰ اور مقننہ کی ذمہ داری ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کے لئے دینی بصیرت اور تقویٰ لازمی ہے، اسی لئے اسلام نے نمائندوں اور ووٹروں کو چند شرائط سے مشروط کر دیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اب تک ہم نے صرف مغربی جمہوریت کے طرزِ انتخاب اور اسمبلیوں کی کارکردگی کا محض اسلامی نقطۂ نظر سے جائزہ پیش کیا ہے۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ اس طرزِ انتخاب کے زندگی کے مختلف پہلوؤں، معاشرتی، اخلاقی، معاشی اور سیاسی، پر کیسے اثرات مترتب ہوتے ہیں۔

مغربی طرزِ انتخاب کے معاشرہ پر اثرات

سیاسی دھڑے بازی:

خودغرضی انسان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ اسی طرح اقتدار کی ہوس بھی اس کی فطرت میں داخل ہے۔ جس ملک میں مغربی جمہوریت کارفرما ہو، وہاں حبِ جاہ کی تکمیل کیلئے میدان پہلے سے تیار ہوتا ہے، کئی سیاسی پارٹیاں وجود میں آتی ہیں اور جب کبھی انتخاب کی تاریخ کا اعلان ہوجاتا ہے تو کئی نئی سیاسی پارٹیاں یوں جنم لینے لگتی ہیں جیسے برسات میں حشرات الارض۔ کرسی کی ہوس ہرکس وناکس کے دل میں گدگدی کرنے لگتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان پارٹیوں میں ہر پارٹی دوسروں کے مقابلہ میں صف آرا ہوتی ہے اور ہر ایک الیکشن جیتنے کے خواب دیکھتی ہے۔ اس طرح ملک کئی سیاسی دھڑوں میں بٹ جاتا ہے جن کی ایک دوسرے سے سرد جنگ شروع ہوجاتی ہے جو بعض دفعہ خطرناک صورت بھی اختیار کرلیتی ہے۔

عداوت ومنافرت کی فضا:

چونکہ اس نظام میں سیاسی پارٹیوں کی تعداد، نمائندہ اور ووٹر کسی پر بھی کوئی پابندی نہیں ہے اس لئے انتشار و عداوت کا یہ سلسلہ سیاسی حلقوں سے نکل کر گھروں میں بھی جا داخل ہوتا ہے۔ گھر میں خاں صاحب اگر ایک پارٹی کا ساتھ دیتے ہیں تو بیگم صاحبہ دوسری سیاسی پارٹی کے ساتھ ہیں اور صاحبزادہ صاحب ایک تیسری پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ سیاسی اختلافات ان کی گھریلو زندگی پر بھی بری طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ چونکہ ہر فرد کو اپنی پارٹی سے تعصبانہ قسم کا لگاؤ ہوتا ہے اس لئے ہر کوئی دوسروں کیلئے جاسوس بن جاتا ہے اور لگائی بجھائی کی وجہ سے بسا اوقات یہ انتہائی قریبی خون کے رشتے ایک دوسرے کے جانی دشمن بن جاتے ہیں۔ انتخابات میں کامیاب تو ایک فریق ہی ہوسکتا ہے۔ جب اسے اپنی کامیابی کی اطلاع ملتی ہے تو وہ فراخدلی کا ثبوت دینے کی بجائے عموماً شکست خوردہ فریق کے سامنے فخر ومباہات کے مظاہرے شروع کردیتا ہے اور کبھی اس حد سے بھی گزر کر اس کی تذلیل شروع کردیتا ہے یا انتقامی کارروائی پر اتر آتا ہے۔ شکست خوردہ فریق چونکہ پہلے ہی غم وغصہ سے بھرا ہوتا ہے لہٰذا ہر دو صورتوں کا نتیجہ بدترین فساد کی شکل میں رونما ہوتا ہے۔ انتخابی سرگرمیاں تو ختم ہوجاتی ہیں لیکن دھڑے بندیاں اور عداوتیں پرورش پاتی رہتی ہیں۔ ہزیمت خوردہ فریق اب اس فکر میں رہتا ہے کہ اگلے الیکشن میں اپنے حریف کو کیونکر پچھاڑ سکتا ہے، اس کیلئے وہ ہر جائز وناجائز حیلہ اختیار

© rasailojaraid:com

© rasailojaraid.com

کرتا ہے جو بذاتِ خود بھی اور نتائج کے لحاظ سے بھی انتہا کی بھیانک ہوتے ہیں ۔ یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا ہے تاآنکہ نئے الیکشن کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں جو جلتی پر تیل کا کام کرتی ہیں ——— اور یہ محض مفروضے نہیں ، اہالیانِ پاکستان کو ان کا خوب خوب تجربہ ہے !

وحدتِ ملی کا فقدان :

یہ سب کچھ تو اسمبلیوں سے باہر ہوتا ہے ۔ درونِ خانہ صورتِ حال اس سے بھی بدتر ہوتی ہے ۔ کہ حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف دونوں یہاں پہنچ کر سابقہ مخالفت کو مزید ہوا دیتے ہیں ۔ حزبِ اختلاف کا اصل مقصد تو یہ بتلایا جاتا ہے کہ وہ حزبِ اقتدار کی پالیسیوں پر تعمیری تنقید کر کے اسے صحیح راہ پر گامزن رکھے لیکن عملاً یہ ہوتا ہے کہ حزبِ اقتدار کے کسی اچھے سے اچھے کام پر بھی تنقید کرنا فرض سمجھا جاتا ہے ۔ گویا اختلاف کرنا ہی اس کی ڈیوٹی ہے ۔

تاہم حزبِ اقتدار آخر حزبِ اقتدار ہے جو ناک پر مکھی بیٹھنا بھی گوارا نہیں کرتا ۔ وہ بھلا حزبِ اختلاف کی تنقید کیوں برداشت کرے ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بسا اوقات اسمبلی میں کرسیوں سے جنگ شروع ہو جاتی ہے جس میں اکثر اپوزیشن ہی پٹتی ہے ۔ اور سابقہ دورِ حکومت میں تو یہ معاملہ یہاں تک بڑھا کہ حزبِ اقتدار نے باہر سے غنڈے منگوا کر اپوزیشن کے ممبروں کو دھکے مار مار کر اسمبلی ہال سے باہر سے نکال دیا تھا ۔

اس کا دوسرا پہلو وہ سیاسی جوڑ توڑ ہے جس کی بنا پر آئندہ الیکشن میں کامیابی کیلئے تیاریاں شروع کی جاتی ہیں ۔ اس جوڑ توڑ میں ہر قسم کے ہتھکنڈوں اور منافقت کو عین سیاسی حکمتِ عملی سمجھا جاتا ہے ۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملی وحدت پارہ پارہ ہو کر رہ جاتی ہے ۔

مغربی جمہوریت کے تحت طریقِ انتخاب کا یہ نتیجہ لازمی اور فطری ہے ۔ اگر کوئی یہ کہے کہ اخلاقی ضابطہ سے ان نتائج کو بدلا جا سکتا ہے تو یہ ایک ایسی بات ہے کہ مشاہدات اور تجربات اس کی تائید نہیں کرتے ۔

انتخابات اور اخلاقی اقدار

انتخابات کے دوران ملکی سطح پر مکر و فریب ، بد دیانتی اور جھوٹ کے جتنے مظاہرے مشاہدہ میں آتے ہیں ، اس سے پہلے یا بعد شاید ہی کبھی ایسی صورت پیش آئی ہو ۔

۱ ۔ بد دیانتی :

آئندہ انتخابات سے سال ڈیڑھ سال پیشتر حزبِ اقتدار یہ کوشش شروع کر دیتا ہے کہ نئی انتخابی حلقہ بندی اس طریقہ سے کی جائے جو ووٹوں کے حصول کیلئے اس کے حق میں مفید ہو ۔ اگر یہ نہیں تو کم از کم حریف کے حق میں نقصان دہ ضرور رہو ۔ فہرستوں کی تیاری بھی چونکہ حکمران پارٹی کی ذمہ داری ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لہٰذا ایسے علاقہ میں جہاں سے اسے کامیابی کی توقع ہوتی ہے، جعلی اور دوہرے ووٹوں کا اندراج بکثرت کرایا جاتا ہے۔ اور جس علاقہ میں اسے اپنی پارٹی کی کامیابی کا امکان کم ہو، وہاں کے بیشتر ووٹ درج رجسٹر ہی نہیں کئے جاتے۔ گویا الیکشن کے انعقاد سے بہت پہلے بددیانتی پر اس کی بنیاد رکھ دی جاتی ہے۔

۲۔ حریف کی تذلیل:

جب کوئی نمائندہ الیکشن کے لئے درخواست دے چکتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس نے اپنے آپ کو ہدفِ تنقید و ملامت بننے کی عام دعوت دے دی ہے۔ اب حریف پارٹی کا یہ حق ہے کہ اس کی نجی زندگی کے جملہ عیوب تلاش کر کے لوگوں میں ان کی ہر ممکن تشہیر کرے، اس کی عزت پر کیچڑ اچھالے — اس کے جن رازہائے دروں اور گناہ ہائے تاریک پر خدا تعالیٰ نے پردہ ڈالا ہوا تھا، خلقِ خدا اسے چاک کرتی اور اسے رسوا اور بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ فرد گزاشت نہیں کرتی۔

الغرض جلسے جلوسوں میں فریقِ مخالف کی تذلیل، اس کی کمزوریوں کی تشہیر، فلاں کتا ہائے ہائے، فلاں پارٹی مردہ باد، خود کو فرشتہ ثابت کرنا اور مخالف کو غدار اور ملک دشمن قرار دینا یہ سب کچھ مغربی جمہوریت کے طرزِ انتخاب کی ایسی شعبدہ بازیاں ہیں جن پر کوئی قانونی گرفت نہیں ہے۔

۳۔ جھوٹے اور ناممکن وعدے:

الیکشن کے دوران عوامی حمایت حاصل کرنے کیلئے ایسے دلفریب نعرے (SLOGANS) اور ایسے وعدے ایجاد کئے جاتے ہیں جن کا پورا کرنا ناممکنات میں سے ہوتا ہے۔ اور عوام میں اتنا شعور نہیں ہوتا کہ وہ ان کی تہ تک پہنچ سکیں۔ مثلاً ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں پیپلز پارٹی نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ ہر کاشتکار کو ساڑھے بارہ ایکڑ زمین مہیا کریگی جبکہ صورتِ حال یہ ہے کہ پاکستان کی کل قابلِ کاشت زمین جس کا اب تک سروے ہو سکا ہے، ۴½ کروڑ ایکڑ ہے لیکن کاشت صرف ۴ء۸ کروڑ ایکڑ ہو رہی ہے۔ پاکستان کی کل آبادی ۷½ کروڑ ہے جس کی ۸۰ فیصد آبادی دیہات میں رہتی ہے۔ پھر اس میں سے ۲۰ فیصد وہ لوگ ہیں جو کھیتی باڑی کا کام کرتے ہیں گویا پاکستان میں تقریباً ایک کروڑ کاشتکار موجود ہیں۔ بالفاظِ دیگر اگر حکومت تمام زمینداروں اور جاگیرداروں سے زمین چھین کر تمام کاشتکاروں میں برابر برابر تقسیم کر دیتی تو بھی پونے پانچ ایکڑ سے زیادہ کسی کے حصہ میں نہیں آ سکتی تھی۔ اس لحاظ سے یہ وعدہ ناممکنات سے تھا اور جھوٹا اس لئے کہ بھٹو نے جو زرعی اصلاحات نافذ کیں تو تمام بڑے بڑے جاگیرداروں اور زمینداروں نے، حتیٰ کہ خود بھٹو نے بھی ایسی قانونی چالیں چلیں کہ ان کے قبضہ سے ایک انچ زمین بھی نہ نکل سکی۔ تاہم اس وعدہ سے الیکشن کے دوران خوب فائدہ اٹھایا گیا اور عوام کی حمایت حاصل کی گئی۔

اسی طرح ہر شخص کو روٹی، کپڑا اور مکان مہیا کرنے کا جو وعدہ دیا گیا تھا، وہ بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جب آئندہ انتخابات قریب آئے تو ۵ مرلہ سکیم چلائی گئی جسے زیادہ تر سیاسی سٹنٹ کے طور پر ہی استعمال کیا جاتا رہا اور عوام کا بیشتر طبقہ اس بھرے میں آ گیا۔

۴۔ سیاسی رشوت:

الیکشن کے زمانہ میں سیاسی پارٹیوں کے قائدین، وفود کی صورت میں عام نجی ملاقاتوں سے بھی شرف بخشتے ہیں اور کامیابی کی صورت میں ان کے مطالبات پورے کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ جس کا اثر بالآخر "خزانۂ عامرہ" پر پڑتا ہے ــــ بیشتر مقامات پر ووٹ کی قیمت نقدی کی صورت میں طے پا جاتی ہے اور پوری آبادی کے ووٹ سیم وزر کی قوت سے حاصل کر لئے جاتے ہیں۔ بعض دفعہ اپنے حریف نمائندہ سے سودا بازی کر کے اس کو الیکشن سے دستبردار ہونے پر آمادہ کر لیا جاتا ہے۔ جس کے لئے اس کے جملہ مصارف کے علاوہ مزید ایک خطیر رقم بھی ہدیہ کی جاتی ہے۔ گویا عوام کا ضمیر، جسے ایک مقدس امانت تصور کیا جاتا ہے، سیاست کی مارکیٹ میں گاجر مولی کی طرح فروختنی چیز بن کر رہ جاتی ہے۔

۵۔ الیکشن کے دوران گھناؤنے جرائم:

حکمران پارٹی جو الیکشن کے ضوابط کے علی الرغم کسی نہ کسی طرح اقتدار سے چمٹی رہتی ہے۔ انتظامیہ کی وساطت سے ناپاک حربے استعمال کرنے پر اتر آتی ہے۔ حریف پارٹی کے نمائندہ پر پولیس کے ذریعہ اسقدر دباؤ ڈالا جاتا ہے کہ وہ مجبور ہو کر الیکشن سے دستبرداری کا اعلان کر دے۔ اور اگر وہ دباؤ میں نہ آسکے تو اسے سرکاری سطح پر رشوت پیش کی جاتی ہے۔ اور اگر پھر بھی کامیابی نہ ہو تو اس کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ قتل کی محض دھمکی ہی نہیں دی جاتی بلکہ حسبِ ضرورت اس کا ارتکاب بھی کیا جاتا ہے۔ الیکشن کے دن ووٹروں کو ڈرایا دھمکایا جاتا ہے۔ جعلی ووٹوں کی بھرمار، گنتی میں عیاری، بیلٹ بکسوں کی تبدیلی، غرضیکہ دھاندلی کی کوئی ایسی قسم باقی نہیں رہ جاتی جسے الیکشن کے دوران استعمال نہ کیا جاتا ہو۔ ان تمام حربوں کے باوجود اگر پھر بھی اپنی کامیابی پر اطمینان نہ ہو تو آخری مرحلہ پر انتظامیہ کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ نتائج کے اعلان کے وقت غلط اعداد و شمار کے ذریعہ اس پارٹی کو کامیاب قرار دے دے۔

یہ ہے انتقالِ اقتدار کا وہ پرامن ذریعہ جس پر مغربی جمہوریت کو ناز ہے۔ الیکشن کے ضوابط خواہ کیسے دلفریب ہوں، الیکشن کے لئے جو فضا تیار کی جاتی ہے یا بن جاتی ہے اس میں ان اصولوں پر کاربند رہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ سنہ ۱۹۷۷ء کے الیکشن میں ہر شخص نے بچشمِ خود یہ مناظر دیکھے ہیں، "جسکی لاٹھی اس کی بھینس" کے مطابق ہی اگر مطلب برآری مقصود ہو تو نہ جانے دنیا کی آنکھوں میں الیکشن کی دھول کیوں جھونکی جاتی ہے؟ (جاری ہے)

© rasailojaraid.com